# پشتو زبان کی معروف لوک داستان: 'آدم خان دُرخانئ'

ڈاکٹر شازیہ عنبرین*

**Abstract:**

"Adam Khan Dur Khanai" is a famous folk tale of Pashtu language. It elaborates the love story of Adam Khan and Dur Khanai, which belongs to Sawat Valley. It is a tragic story which ends at the death of Adam Khan. After the death both are buried in the same grave. This folk story was written by Abdul Qadir Khan Khattak in 1100 Hijri..

خشک، سخت، بلند و بالا پہاڑوں سے ڈھکا ہوا علاقہ اور ہر لمحہ موت سے کھیلنے والے سخت جان، سنگ دل، جنگجو پٹھان اپنے دشمنوں کے لیے جس قدر خطرناک ہیں۔ اپنے دوستوں اور پیاروں کے لیے اتنے ہی نرم دل اور شفیق ہیں۔ وہ جہاں دشمنی نبھانے کے فن میں ماہر ہیں۔ وہاں محبتیں اور رشتے نبھانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وہ بذاتِ خود جتنے سخت جان ہیں ان کی محبتیں بھی اتنی ہی سخت جان اور استوار ہوتی ہیں اور شاید اس لیے بڑی دیرپا بھی ہوتی ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ:۔

؎ بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لیکن اس کے ساتھ ساتھ پشتونوں کے قصے کہانیوں میں 'خونِ دل' کی بُو بھی رچی بسی محسوس کی جا سکتی ہے۔

پشتونوں میں قصے کہانیاں سننے سنانے کا چلن زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ رات کے وقت حجروں میں جہاں موسیقی کی محفلیں جمتی تھیں وہاں قصے کہانیوں کے مراکز بھی یہی حجرے ہوتے تھے۔ داستان گو کو پشتون معاشرے میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پشتونوں میں مقبول کہانیاں، نظم اور نثر دونوں صورتوں میں سنائی جاتی تھیں۔

دورِ حاضر کے جدید اور متمدن دور میں بھی یہاں کے دیہاتی زندگی میں حجروں کو وہی زمانہ قدیم جیسی اہمیت حاصل ہے جہاں منظوم داستانیں ساز کی لے پر بڑی دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی ہیں البتہ موجودہ دور میں داستان

* استاد شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

گویوں کی جگہ ٹیپ شدہ بدلوں اور کہانیوں نے لے لی ہے۔اس سلسلے میں پشاور کے سب سے بڑے اور مشہور قصہ خوانی بازار کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ جہاں قدیم دور میں جگہ جگہ پشتون داستان گو صبح سویرے ہی اپنے آگے زمین پر چادریں بچھائے، کان پر ہاتھ دھرے، کھڑے یا بیٹھے بیٹھے، اونچی مترنم آواز کے ساتھ مخصوص لَے میں گھنٹوں اپنے حافظے سے منظوم ومنثور داستانیں، قصے اور کہانیوں سنایا کرتے تھے اور ہر قصہ خواں کے اردگرد لوگوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا۔ یا پھر قومی اجتماعات اور میلوں ٹھیلوں میں یہ داستان گو نظر آتے تھے۔ **(۱)**

پشتونوں کی موجودگی کے آثار ہندوستان میں دراوڑی تہذیب سے بھی پہلے کے ہیں اور جب آریاؤں نے دراوڑوں کو پیچھے دھکیل دیا تو اس وقت پشتون قبائل نمایاں حیثیت رکھتے تھے چونکہ آریاؤں کی مذہبی سیاسی اور جنگی سرگرمیوں میں پشتونوں کی نمایاں حیثیت تھی اس لیے اکثر محققین نے پشتونوں کو بھی آریا ہی سمجھا۔پشتو کے قدیم ترین ٹپے کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈنمارک کے محقق پادری جینز انولڈسن (Jens Envelodson) لکھتے ہیں:۔

> ''Actually the tribal code is the old Aryan code of honour. Which one may find in force in the early stages of all, Indo-European peoples. Take the old Scandinavian Sages and change geographical and personal names and you have an epic tribal history of Pakhtoons. Particularly in the tappas-which are mostly composed by woman we find descriptions of ideal manhood, and the virtues-honours, bravery, justice which the young girl would look for in her beloved are the old Aryan virtues.'' **(۲)**

(ترجمہ)''پشتونوں کا قبائلی دستور آریاؤں کا ضابطہ حیات بھی ہے۔ جو تمام ہندآریائی لوگوں کے ابتدائی ادوار میں نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر سیکنڈی نیوئن ممالک کے لوگوں کی جرأت و بہادری کے قصوں کو اگر دیکھا جائے تو ان کے صرف ناموں اور جگہوں کی تبدیلی سے پشتونوں کی رزمیہ تاریخ بن جاتی ہے۔خاص طور پر وہ ٹپے جو عورتوں نے تخلیق کیے ہیں۔ان میں ایک مثالی شخصیت یا ہیرو کے اوصاف مثلاً عزت، بہادری اور انصاف کو جو نوجوان لڑکیاں اپنے محبوب میں دیکھنا چاہتی ہیں۔وہ قدیم آریاؤں کی اقدار ہیں۔''

پشتو کا لوک ادب اس سے بھی بہت قدیم ہے لیکن تحریر میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے صرف آریائی دور تک ہی اس کا کھوج لگایا جاتا ہے۔ ویدک ادب، اوستائی تحریروں اور مہابھارت میں بھی پشتو زبان اور پشتونوں کا تذکرہ ملتا ہے لیکن وہاں بھی ادبی اور تحریری نمونہ دستیاب نہیں۔

پشتو لوک داستانوں کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ پشتو زبان معلوم شدہ تاریخی حقائق اور دلائل کی روشنی میں 5000 سال پرانی ہے۔(۳) مگر پشتو لوک کہانیاں اور پشتو ٹپے اتنے ہی قدیم ہیں جتنی قدیم پشتون قوم ہے۔

پشتو لوک داستانیں منظوم اور منثور ہر دو صورتوں میں ملتی ہیں یہ داستانیں سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے یہ داستانیں رومانوی اور عشقیہ بھی ہیں، رزمیہ اور حماسیہ بھی۔ کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جو درس عبرت کے لیے لکھی گئیں۔

پشتو داستان کے ابتدائی آثار گیارہویں صدی ہجری کے اولین دور میں ملتے ہیں۔ روشینہ تحریک سے منسلک شاعر ارزانی خویشکی کی تحریر حضرت محمدؐ کے خواب نامے کا منظوم قصہ داستانی انداز کا حامل ہے مگر داستانی خصوصیات کا حامل باقاعدہ قصہ خوشحال خان خٹک کے بیٹے سکندر خان خٹک نے ۱۰۹۰ھ میں لیلیٰ مجنوں کے نام سے منظوم کیا۔ اس کے بعد خوشحال خان خٹک کے دو اور بیٹوں صدر خوشحال خاں خٹک اور عبدالقادر خاں خٹک نے بالترتیب دلے شھئ اور یوسف زلیخا کے نام سے داستانیں لکھ کر اس روایت کو اور بھی مستحکم کیا۔(۴)

جبکہ محمد افضل رضا کی تحقیق کے مطابق پشتو کی سب سے پہلی معلوم شدہ منظوم داستان ’’آدم خاں درخانئ‘‘ ہے جو عبدالقادر خان خٹک نے ۱۱۰۰ھ کے آخر میں لکھی۔(۵)

پشتو کی اس معروف لوک داستان کو مختلف شاعروں اور ادیبوں نے مختلف ادوار میں نظم کیا اور نثری قصے کی صورت میں بھی لکھا۔ عبدالقادر خان خٹک کے علاوہ ’’آدم خان دُرخانئ‘‘ کے قصے کو برہان خان، ملا نعمت اللہ نوشہروی، سید ابوعلی شاہ اور صدر خان خٹک نے نظم کیا جبکہ مسعود احمد خان، شوکت اللہ خان اکبر، مولوی احمد صاحبزادہ فخر الدین نے یہ قصہ پشتو نثر میں تحریر کیا۔

اس رومانوی داستان نے نرگس اور رومانوں کی حسین ترین وادی سوات میں جنم لیا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس لوک داستان کا تعلق ہرنائی پشین کے قریب علاقہ کاکڑستان سے جوڑا ہے۔(۶)

یہ رومان کس زمانے میں گذرا؟ اس سلسلے میں کوئی حتمی اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا البتہ اس داستان میں مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے بار بار ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اسی عہد میں رونما ہوا۔ اکبر کا دور حکومت ۹۲۳ھ تا ۱۰۱۴ھ ہے۔ اس طرح آدم خان اور درخانئ کی زندگی یقیناً ۱۰۰۰ھ تک ہے اور یہ واقعہ ۹۵۰ھ سے بعد کا ہے۔(۷)

'آدم خان درخانئ' ایک رومانوی المیہ ہے۔ جس میں باز درہ بالا کے آدم خان اور باز درہ پایاں کی درخانئ کی محبت کی داستان رقم کی گئی ہے۔ لیکن یہ صرف آدم خان اور درخانئ کے عشق کی داستان نہیں ہے بلکہ یہ پشتونوں کی تہذیب، روایات، معاشرت اور ثقافت کی آئینہ دار بھی ہے۔

اس میں بلند و بالا سرسبز اور پرشکوہ پہاڑوں کا تذکرہ بھی ہے جہاں آدم خان اور درخانئ کا رومان مخصوص پروان چڑھا، پشتونوں کے حسن جہاں سوز کے نظارے بھی ہیں۔ خاندان برادری کے آپس کے تعلقات، رشتے اور ریت رواج کا رنگ بھی ہے۔ رقص وسرود اور رباب کی تاروں سے نکلنے والے نغموں کی آواز بھی ہے اور شادی بیاہ کی رسومات کی دھوم دھام بھی ہے۔ ہجر و وصال کے قصے بھی ہیں اور پشتونوں کی بہادری، شجاعت، جنگ وجدل اور منتقم مزاجی کے واقعات بھی۔ عشق ومحبت میں جو لینے کی ہمت بھی ہے اور محبوب کی جدائی میں دنیا کو چھوڑ دینے کی جرأت بھی۔ اس لوک داستان کے مرکزی کردار روایتی داستانوں کی طرح بے حد حسین وجمیل ہیں۔

> ''آدم خان پھولوں سے زیادہ حسین تھا نہایت بہادر، ذہین اور خوش گلو..... وہ رباب بجانا بھی جانتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں اس قدر سوز و گداز اور رس بھرا ہوا تھا کہ رباب کے تاروں کو چھیڑتے ہی وہ سننے والوں کے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتا۔''(۸)

آدم خان کے حسن کا سکہ اس کے گاؤں کی ہر لڑکی کے دل پر بیٹھا ہوا تھا اور ہر لڑکی اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی۔ دوسری طرف درخانئ کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کے علم کا ڈنکا بھی پورے علاقے میں بج رہا تھا۔ یہ اس کا حسن تھا کہ اس کا علم باز دہ درہ پایاں کا ایک شخص 'پایاؤ' نہ صرف اس کے عشق میں مبتلا ہوا بلکہ درخانئ کے ساتھ رشتہ جوڑنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ نہایت دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا ئی گئی۔ پایاؤ کو گویا دنیا میں ہی درخانئ کی شکل میں جنت مل گئی۔ اس کی خوشی اور شادمانی قابلِ دید تھی۔

دوسری طرف آدم خان تھا جس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ایک ہی پری رُو کے خواب دیکھے تھے اور اسی کے عشق میں اس کے رباب سے نغمے پھوٹتے تھے اور اسی کی محبت میں اس کے ٹپوں میں سُر جاگتے تھے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی خیال محبوبہ کا وجود اس حقیقی دنیا میں بھی ہوسکتا ہے اور ایک روز وہ جیتی جاگتی سانس لیتی حسین مورت اس کے سامنے ہوگی لیکن اس کی انگلی میں کسی اور کے نام کی انگوٹھی ہوگی۔ درخانئ بھی اپنے خوابوں میں آنے والے شہزادے کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر حیران تھی۔ آدم خان درخانئ کی بظاہر یہ پہلی ملاقات باز درہ بالا کی ایک شادی میں ہوئی لیکن درحقیقت ان دونوں کی روحیں تو روز ازل سے ایک پیمان وفا میں بندھی ہوئی تھیں۔

عاشقوں کے لیے رات کی تاریکی کسی نعمت سے کم نہیں وہ پیار کرنے والے جو دن کے اجالے میں نہیں مل پاتے رات کا اندھیرا ان کے لیے محبوب کے وصل کا پیامبر بن کر آتا ہے۔ سوہنی بھی گھڑے پر سوار ہوکر رات کے پچھلے پہر ماہینوال سے ملنے جاتی تھی۔ ہیر اور رانجھے کی ملاقاتیں بھی رات کے اسی پہر ہوا کرتی تھیں۔ آدم خان درخانئ کا

عشق بھی رات کے آخری پہر ہونے والی چند ملاقاتوں میں پروان چڑھا لیکن ہمیشہ کی طرح سحر کا اجالا محبت کرنے والوں کے لیے جدائی اور درد کا پیغام لیکر آتا ہے۔

''باہر درخانئ کے باپ کی بھیڑ میائی..... درخانئ پکاری 'اے میرے ابا کی بھیڑ- خدا کرے تیرے گلے میں زخم ہو جائیں''
ابھی سحر نہ تھی تو نے سحر کر دی۔ میری آغوش سے میرا شہزادہ آدم جدا ہو گیا۔''
جب آدم خان رخصت ہونے لگا تو درخانئ نے روتے روتے اپنی آنکھیں سرخ کر دیں اور یہ شعر کہے:
''اے خان! میں نے جو باتیں تم سے کیں ان میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ کوئی اور ہماری محبت کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ ابھی دنیا نہیں جانتی، کہ میں نے کیوں رُو رُو کر آنکھیں سرخ کر دیں۔ میں کیوں نہ روؤں۔ اے آدم خان! سحر کے مرغ جگہ جگہ اذانیں دینے لگے ہیں۔''**(۹)**

لوک شعر و ادب کی روایتیں چونکہ زبانی (oral) ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریری صورت میں آنے کے بعد بھی ان میں مختلف واقعات اور کرداروں کا اختلاف پایا جانا قرین قیاس ہے۔ آدم خان درخانئ کی رومانوی لوک داستان کے مختلف شعری و نثری مستون میں بھی اس طرح کے کئی اختلافات ملتے ہیں۔ جو مختلف زبانی روایتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً آدم خان درخانئ کے عشق کو پروان چڑھانے میں مددگار پیغام رساں کا کردار کئی روایتوں میں ایک بڑھیا نے نبھایا اور کئی روایتوں میں درخانئ کے معلم، سہیلیوں اور آدم خان کے دوستوں میر و اور بالو نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔

پشتونوں کی بیشتر لوک داستانیں طبع زاد ہیں جس میں ان کے اپنے علاقے، اپنی تہذیب اور روایات کی بو باس موجود ہے جبکہ دوسری زبانوں سے بھی کچھ داستانیں ترجمہ کی گئیں جن کو اپنا خاص رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ لوک داستانیں پشتون معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان میں پشتونوں کی بہادری، شجاعت غیرت، محبت، وفا، قربانی اور ان کی ہنگاموں سے بھرپور زندگی کے مختلف رنگ، جن میں رنگینی کے ساتھ سنگینی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ تیر و تفنگ کے ساتھ ساتھ میدان جنگ کے مختلف مناظر، کلاشنکوف اور بارُود کی بو پشتونوں کے بیشتر رومانوی قصوں کی جان ہے۔ جن میں میمونئے، موسیٰ خان گل ملئ، جلات محبوبہ، تور دلے شھئ، فتح خان رابعہ، یوسف خان شیر بانو مومن خان شیرینو، ولی جان تانو خاص شہرت کی حامل ہیں۔

آدم خان درخانئ کے عشق کی داستان میں بھی پشتونوں کا یہ خاص رنگ شروع سے آخر تک قصے پر چھایا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً آدم خان درخانئ سے پوچھتا ہے:۔

''تمہاری تو منگنی ہو چکی ہے اور تم دوسرے کی ہو جائی گی..... کیا میرے نغمے

ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیں گے.....؟

جواب میں وہ پختون لڑکی بولی

''تم شاید بھول گئے ہو کہ تمہارے پاس رباب کے ساتھ ساتھ بندوق بھی تو ہے جو تمہاری جرأت اور ہمت کا امتحان لے سکتی ہے.....ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہیں.....رباب نہیں تو بندوق۔''(۱۰)

یہ وہ درس ہے جو ہر پشتون کی رگوں میں لہو کے ساتھ بہتا ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو ہر پشتون بچہ ماں کی گود میں ماں کے دودھ اور ماں کی لوری کے ساتھ سیکھتا ہے۔ اسی ضابطہ حیات کو لیکر ایک پٹھان ایک پوری زندگی بسر کرتا ہے۔

اس پشتون معاشرے میں عورت کو مرد نے ہمیشہ اپنی ملکیت سمجھا اور ملکیت کی چیزوں سے ان کی رضا کبھی نہیں پوچھی جاتی۔ اسی قانون کے پیش نظر آدم خان درخانئ کے عشق کی بھنک ملتے ہی درخانئ کے باپ نے اس کی رضامندی کے خلاف اس کو پایاؤ کے ساتھ رخصت کر دیا۔

درخانئ تو اس غم سے نڈھال چارپائی سے لگ گئی جبکہ آدم خان کی تڑپ دیکھ کر اس کے باپ حسن خان نے 'میر مائی' جو اس علاقے کا سب سے طاقتور خان تھا، کے ذریعے درخانئ کو اس کے شوہر پایاؤ کے گھر سے اٹھوالیا۔ احتیاطاً چند دنوں کے لیے درخانئ کو میر مائی کے گھر رکھا گیا تا کہ پایاؤ سے طلاق حاصل کرانے کے بعد اس کی آدم خان سے شادی کرادی جائے۔ یہی وہ المناک غلطی تھی جس کے بعد اس کہانی کے کردار خود بخود منطقی انجام کی طرف بڑھنے لگے۔

میر مائی اس داستان کا سب سے جاندار کردار ہے جس کے ہاں نہ صرف ہمیں ارتقائی مراحل ملتے ہیں بلکہ اس کے کردار کی مختلف جہتیں ہیں جو اس کردار کو زندگی دیتی ہیں۔ میر مائی کا انداز بالکل پیشہ ورانہ ہے۔ ایسے لوگ کسی کے دوست نہیں ہوتے جہاں سے ان کو زیادہ مفاد ملنے کی امید ہوتی ہے ان کا جھکاؤ اسی طرف ہو جاتا ہے۔ درخانئ چونکہ میر مائی کے ڈیرے پر تھی پایاؤ کے لیے میر مائی کو خریدنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ بھاری رقم دے کر پایاؤ درخانئ کو واپس لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن آدم خان نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور اپنے دوستوں میرو اور بالو کے ساتھ جوگیوں کے بھیس میں درخانئ کے گھر کے سامنے ڈیرے ڈال کر جا بیٹھا لیکن افسوس اس کا یہ حربہ بھی زیادہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ بہت جلد پایاؤ پر اس کا بھید کھل گیا۔

ہر طرف سے ناامید ہو کر حسن خان نے اپنے بیٹے آدم خان کا گھر بسانے کا ارادہ کیا تا کہ وہ درخانئ کا غم بھول جائے لیکن یہ غم عشق تھا جو عاشقوں کی جان کا نذرانہ لیے بغیر ان کا دامن نہیں چھوڑتا۔ درخانئ کی جدائی نے آدم خان کی زندگی کا ہر دروازہ بند کر دیا۔ آدم خان کی موت کی خبر سے پہلے درخانئ نے خواب میں دیکھا کہ ایک

نہایت خوبصورت باغ ہے جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر کر رہی ہے، یکا یک باغ کے ایک کونے سے رباب کے نغمے پھوٹنے لگے۔ درخانئ نے حیران ہو کر اس طرف دیکھا تو ایک تالاب میں چاندی کی کشتی پر سوار آدم خان رباب کی دھن پر اس کی محبت کا گیت گا رہا تھا۔ جونہی اس نے درخانئ کو دیکھا۔ اپنی بانہیں اس طرح پھیلا دیں جیسے اسے بھی اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہو اور اس کے ساتھ ہی درخانئ پانی کی لہروں میں تیرتی ہوئی۔ اس کی آغوش میں چلی گئی۔ پلک جھپکنے میں وہ تالاب ایک سمندر میں تبدیل ہو گیا۔ جس میں ایک خوفناک طوفان آیا اور کشتی بری طرح ہچکولے کھاتی ڈوبنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی درخانئ کی آنکھ کھل گئی۔''(۱۱)

آنکھ کھلتے ہی اسے پتہ چلا کہ آدم خان اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ یہ سنتے ہی اس نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔

روایت ہے کہ تین بار آدم خان اور درخانئ کی قبریں کھود کر دیکھی گئیں مگر ہر بار انہیں یکجا پایا گیا۔ یہ دونوں ایک ہی لحد میں دفن ہیں محض نشانی کے طور پر ان میں ایک معمولی سی حد رکھی گئی ہے۔ ان کے مزار کے متعلق بھی دو روایتیں مشہور ہیں:۔

> ''ایک روایت ہے کہ یہ مزار سوات میں باز درہ کے مقام پر ہے لیکن اکوڑہ کے پاس موضع ترلاندی میں دریائے لنڈا کے کنارے ایک مزار کے متعلق لوگوں کا یقین ہے کہ یہ انہیں دونوں کی آخری آرامگاہ ہے۔ اس گاؤں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ آدم خان اگرچہ باز درہ کا رہنے والا تھا لیکن درخانئ اسی گاؤں کی تھی۔ ایک اور روایت ہے کہ آدم خان کے باپ حسن خان کو طورو کی نوابی ملی ہوئی تھی اور زڑہ میانہ ترلاندی، مصری بانڈہ، علی تو تک اور دوسرے گردونواح کے چند گاؤں اس کی خانی کے زیر اثر تھے۔ ان دنوں یہ گاؤں سوات کے یوسف زئیوں کے بانڈے، چھوٹے چھوٹے گاؤں ہوا کرتے تھے لیکن آج کل یہ سب علاقہ خٹک میں شامل ہے۔''(۱۲)

آدم درخانئ کے مزار پر آج بھی دور دور سے زائرین آتے ہیں۔ منتیں مانگتے اور مرادیں پاتے ہیں۔ اس گاؤں کے لوگ بارش کے لیے دعا مانگنے یا کسی آسمانی آفت یا وبا سے بچنے کے لیے خیرات کرتے ہیں تو اس مزار پر جمع ہوتے ہیں یہ مزار پتھروں کی ایک چار دیواری میں ایک چبوترے پر بنا ہوا ہے۔ مزار کے ساتھ ایک جگہ جگہ سے ترشی ہوئی بیری ہے۔ کئی ایسے لوگ جو رباب سیکھنا چاہتے ہیں اس جڑواں قبر کے ساتھ لگی اس بیری سے لکڑی کے ٹکڑے کاٹ کر مضراب بناتے ہیں اور مہینوں یہاں ڈیرے ڈالے رہتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ:۔

> ''جو شخص آدم خان کے مزار کے درخت سے لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لیکر اسے مضراب کے طور پر استعمال کرے، وہ فوراً رباب بجانا سیکھ لیتا ہے۔''(۱۳)

## حوالہ جات


۱۔ خاطر غزنوی، ''سرحد کے رومان''، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ۱۹۶۵ء، ص۲۰

۲۔ Enveldson, Jens، '' Sound the dells, O moon arise and shine''، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ص۲

۳۔ محمد افضل رضا، ''پشتو لوک ادب''، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص۱۳۰

۴۔ حنیف خلیل، ''مختصر تاریخ زبان وادب''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص۱۱۱، ۱۰۰

۵۔ عبدالقادر خان خٹک (پ۱۰۶۳ھ-و۱۱۲۶ھ) پشتو کا بہت بڑا کلاسیکی شاعر ہے۔ خوشحال خان خٹک کے بیٹے ہونے کی حوالے سے عبدالقادر خان خٹک اپنے والد کے اسلوب اور مکتب کے پیروکار تھے لیکن شعری موضوعات اور ڈکشن دونوں حوالوں سے وہ رحمان بابا کے بہت قریب تھے۔ خوشحال خان خٹک کی طرح وہ عبدالقادر خان خٹک صاحب سیف بھی تھے۔ کئی معرکوں میں اپنے والد کے ہمرکاب رہے۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے نوشہرہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔

عبدالقادر خان خٹک صاحب دیوان ہونے کے علاوہ مصنف، مولف اور مترجم بھی تھے۔ وہ ساٹھ کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان کی صرف چھ کتابیں دستیاب ہیں۔ 'آدم خان درخانئ' کے علاوہ انہوں نے گلستان سعدی، یوسف زلیخا اور قصیدہ بردہ شریف کا پشتو زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کے شعری موضوعات میں تصوف، اخلاقیات اور حسن وعشق کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان کی شاعری اعلیٰ پایہ کی ہے۔

۶۔ شفیع عقیل، ''پاکستان کی لوک داستانیں''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۱۷۳

۷۔ خاطر غزنوی، ''سرحد کے رومان''، ص۴۳-۴۲

۸۔ ایضاً، ص۴۴

۹۔ ایضاً، ص۴۷-۴۸

۱۰۔ شفیع عقیل، ''پاکستان کی لوک داستانیں''، ص۱۸۰

۱۱۔ ایضاً، ص۱۸۹

۱۲۔ خاطر غزنوی، ''سرحد کے رومان''، ص۵۱

۱۳۔ ایضاً، ص۴۲